Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 18. Issue 01, June 2026

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 25th February, 2026 | Accepted: 15th June, 2026 | Available Online: 30th June, 2026
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v18i01.452

منشا یاد کے افسانوں میں ماحولیاتی تبدیلی اور ثقافتی مہاجرت کی عکاسی

Reflection of Environmental Change and Cultural Migration in the Short Stories of Mansha Yaad

DR. SAKINA SIDDIQUE[1] AND DR. KAUSAR PARVEEN[2]
[1] Lecturer, Department of Urdu, Government Graduate College for Women Rawalpindi, Pakistan
[2] Assistant Professor, Ghazi National Institute of Engineering & Sciences, Dera Ghazi Khan, Pakistan
Corresponding author: Dr. Sakina Siddique (sakinasiddique1@gmail.com)

ABSTRACT: Urdu fiction functions not only as an artistic expression but also as a significant medium for social and environmental awareness. This study explores reflections of environmental change and cultural migration in the short stories of Mansha Yaad, highlighting the interrelationship among human life, nature, and culture. His narratives depict the transformation of rural and urban landscapes, the gradual erosion of ecological balance, and the social forces that reshape traditional ways of life.
Through vivid portrayals of villages, natural environments, and human relationships, Mansha Yaad represents the environmental consequences of modernization, migration, and social inequality. His stories further illustrate how cultural displacement and changing lifestyles contribute to the decline of human values and ecological harmony. The study also examines his ecological sensitivity and concern for the future of humanity and other living beings. Mansha Yaad emerges as an eco-conscious writer whose fiction documents the intertwined crises of environmental degradation and cultural transition, emphasizing the urgent need to preserve both nature and cultural identity.

CONFLICT OF INTEREST: The authors declare that there are no conflicts of interest related to the research, authorship, and/or publication of this article, and that the data presented have not been fabricated or falsified.

FUNDING: This research did not receive any specific grant or financial support from public, commercial, or not-for profit funding agencies.

PARTICIPANT CONSENT: The authors confirm that Informed consent was obtained from all participants, and confidentiality was duly maintained.

KEYWORDS: Climate Change, Human Nature, Change of Culture Value, Frozen Food, Polluted Air, Loss of Natural Resources, Uncertainties

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-Non Commercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

انسان اور فطرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارا ماحول ہمارے خیالات، احساسات اور جذبات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ انسان نے اپنی مادی ترقی کی وجہ سے فطرت سے دوری اختیار کی اور فطرت کو اپنے مفادات کی خاطر قربان کر رہا ہے۔ ماحول کی زبوں حالی نے اس کو ذہنی انتشار اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔ انسانی تجربات کا نچوڑ تخلیقی فن پاروں کی صورت میں نمایاں ہوتا

ہے۔ان فن پاروں کا تجزیہ تنقید کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ تنقید کی ایک قسم ماحولیاتی تنقید بھی ہے اس لیے ماحول اور ادب کا تعلق ماحولیاتی تنقید کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ماحولیاتی تنقید کا سب سے بڑا محرک فطرت اور سماج ہے۔ڈاکٹر بشارت نور کے مطابق:

> "ماحولیاتی تنقید میں انسانی اور غیر انسانی، فطری اور غیر فطری عناصر کے درمیان حدود و قیود کو ماحولیاتی بحران اور اس کے حل کے طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر سہیل احمد کے مطابق ماحولیاتی مطالعہ اور تنقید کی بنیاد لارنس بائل اور جو نھتن بیٹ نے ڈالی ان دونوں نے اسے Environmental criticism کا نام دیا۔(۲)

جس کو ماحولیاتی شعریات بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک سائنسی طرز کی ادبی تنقید ہے، جو ثقافتی، سیاسی اور مزاحمتی انداز میں خود کو متعارف کرواتی ہے۔ماحولیاتی تنقید کو مختلف ممالک نے مختلف ادوار میں اپنایا۔ امریکہ میں ماحولیاتی تنقید کا باقاعدہ آغاز گزشتہ صدی میں اسی کی دہائی جبکہ روس میں نوے کی دہائی میں ہوا۔ماحولیاتی نقاد شیرل گلاٹ فیلٹی نے اس اصطلاح کی تجدید کی اور اس کو ماحولیاتی تنقید کی بجائے سبز مطالعات کہنے پر اصرار کیا جب کہ ادبی دنیا میں اس کو Eco criticism کے نام سے مانا جاتا ہے شیرل گلاٹ فیلٹی نے ماحولیاتی تنقید کی تعریف ان الفاظ میں کی:

> "What then is Eco criticism?Simplyput, ecocriticism is the study of the relationship between literature and the physical environment. Just as feminist criticism examines language and literature from a gender conscious perspective and Marxist criticism brings an awareness of modes of production and economic class to its reading of texts, ecocriticism takes an earth centered approach literary studies."(۳)

ترجمہ: پھر ایکو کرٹیسزم کیا ہے؟ سادہ الفاظ میں ایکو کرٹیسزم ادب اور طبعی ماحول کے درمیان تعلق کا مطالعہ ہے۔ جس طرح حقوق نسواں زبان اور ادب کو صنفی شعور کے نقطہ نظر سے پرکھتا ہے، اور مارکسی تنقید اپنے متن کے پڑھنے کے لیے پیداوار کے طریقوں اور معاشی طبقے کے بارے میں آگاہی لاتی ہے، اسی طرح ایکو کرٹیسزم ایک زمینی مرکزی ادبی نقطہ نظر کو اپناتا ہے۔

اس تنقید میں ہم فطرت، ثقافت اور ماحول کو لاحق خطرات کی نشان دہی کرتے ہیں جن میں بنیادی طور پر گلوبل وارمنگ ،ماحولیاتی آلودگی ،اوزن کی لہر کا باریک ہونا،زمین کی اندرونی ساخت ،برفانی تودوں کا پگھنا ،اٹیم کے تابکاری اثرات ،جنگلات کا کٹاؤ ،جانوروں اور پرندوں کا ناپید ہونا، کھیتی باڑی کی پیداوار میں اضافہ کے لیے استعمال کی جانے والی کھادوں اور اسپرے کے نقصانات شامل ہیں۔اس کے لیے دو اصطلاحات حیاتیاتی مرکزیت اور بشری مرکزیت استعمال کی جاتی ہیں یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حیاتیاتی مرکزیت میں کائنات کی سب چیزوں کو مساوی اہمیت حاصل ہے جب کہ بشری مرکزیت میں انسان کو افضل درجہ حاصل ہے۔ ناصر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 18. Issue 01, June 2026

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

عباس نیر کے مطابق بشری مرکزیت کی اصطلاح ۱۸۶۰ء میں ڈارون کے نظریہ ارتقا کے وقت پیش آئی اس میں انسان کو اشرف المخلوقات ہی نہیں مانا جاتا ہے بلکہ اس کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کائنات کو فائدہ دے یا نقصان دے۔اس تنقیدی اصطلاح کے تحت دو سوال بہت اہم ہیں:

1۔انسان کس طرح ماحول کو نقصان پہنچا رہا ہے؟

2۔ماحول کن وجوہات کی بناء پر ساز گار نہیں ہے؟

ماحولیاتی تنقید کی چار اہم ترین اقسام ہیں: حیاتیاتی مرکزیت، بن نگاری، مظاہر پسندی اور ایکوفیمنزم ہیں۔حیاتیاتی مرکزیت میں اخلاقی رویے اور انسانی فطرت کو بنیاد فراہم کی جاتی ہے۔حیاتیاتی معاشرے کی اصطلاح تمام جانداروں کے لیے مستعمل ہے جس میں نباتات، حیوانات اور بشریات شامل ہیں۔مظاہر پسندی کا مطلب روح ہے۔ڈاکٹر بشارت نور کے مطابق

"ای۔بی ٹیلر نے اپنی کتاب primitive culture میں یہ فلسفہ دیا کہ کائنات کی ہر چیز ایک روح، ایک soul رکھتی ہے، چاہے وہ پتھر ہو یا شجر، پانی ہے یا سمندر"(۴)

ایکوفیمنزم میں پدر سری نظام کے تحت عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کو ماحول کی تباہی کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔جس طرح تانیثیت میں عورت کو از سر نو دریافت کیا جا رہا ہے اس طرح ماحولیاتی تانیثیت میں فطرت کی بحالی اور فطرت نگاری کی اہمیت کو سمجھنا سمجھانا ادب کا لازمی جز ہے۔

انسان اور اس کی تخلیقات تاریخ و ثقافت کے ساتھ ساتھ فطرت اور ماحول سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔دنیا کا زیادہ تر ادب انسان کی روحانی، مذہبی، نفسیاتی اور سماجی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ماحولیاتی ادب بھی ان ہی تصورات کا خاصہ ہے۔ادب میں فطرت کا اظہار فطرت نگاری اور منظر نگاری کی صورت میں کیا جاتا ہے مگر ان دونوں میں فرق ہے۔منظر نگاری سے مراد سامنے آنے والی اشیاء کی عکاسی کرنا جب کہ فطرت نگاری سے مراد نظر آنے والی فطری اور اصلی اشیاء ہیں ادب میں فطرت کی ترجمانی کس طرح کی گئی ہے اس کے اظہار کے لیے انسانی زبان میں کن تشبیہات، استعارات اور علامات کو استعمال کیا گیا ہے۔اردو ادب میں ان اصطلاحات کا استعمال انیسویں صدی میں کیا گیا۔سرسید احمد خان نے فطرت کو خدا کے دین کے مترادف قرار دیا۔انجمن پنجاب کے تحت حالی اور آزاد کی طرح نظموں کے موضوعات پر مشاعرے اور مولوی امداد امام عصر کی "کاشف الحقائق" شامل ہے۔

دوسری اصناف نثر کی طرح افسانہ بھی ادب کی اہم صنف ہے جو صنعتی دور کے بعد لکھا جانے لگا، اس میں زندگی کے کم و بیش تمام موضوعات کو جگہ دی گئی ہے۔اس میں دیہاتوں کے مناظر اور موضوعات کو منفرد انداز میں پیش کیا جاتا ہے ان ادیبوں میں پریم چند، احمد ندیم قاسمی اور منشایاد کے نام سرفہرست ہیں۔منشایاد نے تقریباً تمام نثری اصناف میں طبع آزمائی کی مگر ان کی ادبی شناخت اردو افسانہ ہی بنا۔منشایاد نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تو افسانے میں علامت اور تجرید کی وجہ سے کہانی غائب ہو گئی تھی۔ایسے حالات میں افسانے کا قاری بیزار ہو چکا تھا۔منشایاد نے علامت اور کہانی کے ذریعے قاری کو افسانے کی طرف راغب کیا۔وہ ممکنا حد تک پڑھنے والوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔انہوں نے کہانی کے ذریعے علامتوں کو سہل ہی نہیں بنایا بلکہ وقت کی رو میں بہہ جانے کی بجائے اپنا الگ مقام

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 18. Issue 01, June 2026

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

بنایا۔اس لیے یہ جدید افسانوں کے پیش رو کہلائے۔انہوں نے ادب کا رشتہ زندگی،زمین اور روایت سے استوار کیا۔ان کے نو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا شمار ان افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے جن کی جنم بھومی دیہات تھی مگر حصول روزگار کے سلسلے میں شہروں میں قیام کرنا پڑا۔انہوں نے اپنے افسانوں میں اسی دیہاتی آدمی کو تلاش کیا ہے جس کا رابطہ فطرت سے منقطع ہو چکا تھا اور اپنے افسانوں کے نام فطری اشیاء اور جانداروں کے ناموں پر رکھے جیسے درخت آدمی،ایک تھی فاختہ،بند مٹھی میں جگنو،جڑیں اور بیل وغیرہ۔یہ نام ان کی ماحول دوستی اور انسانی رشتوں کے احترام کی غماضی کرتے ہیں۔وہ عصری ایجادات اور ترقی کے ادب پر اثرات کہ حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

"سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ انسان روز بروز مشین میں ڈھلتا جارہا ہے اور نت نئے تباہ کن ہتھیار ایجاد کرتا ہے۔کمپیوٹر کی ترقی نے اسے ادبی اور شعری ذوق سے دور اور بے بیگانہ کر دیا ہے۔"(۵)

ہماری ایک قدیم تہذیب ہے جو زیر زمین دفن ہے جبکہ ایک جدید تہذیب ہے جو سطح زمین پر آباد پھل پھول رہی ہے۔قدیم تہذیب کو آثار قدیمہ کے ماہرین صدیوں سے دریافت کر رہے ہیں مگر جدید تہذیب کی تعمیر پر کام بہت دیر بعد شروع ہوا،اس تہذیب کی تعمیر و تشکیل کے لیے دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ منشایاد ایک ماہر ارضیات کے طور پر سامنے آتا ہے۔منشایاد کے افسانوں کا تنوع متفرق واقعات سے جنم لینے والے فوری مگر عارضی نوعیت کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔

انسان اس کائنات میں اشرف المخلوقات میں شمار ہوتا ہے جو اس کی طاقت،برتری اور اختیارات کی علامت ہے۔طاقت اور اختیار کے ذریعے انسان اس زمین کا حاکم اور حکمران کہلاتا ہے۔حکمرانی کرنے کے لیے اس کو طاقت کی ضرورت ہے جس کا اظہار وہ جنگ کی صورت میں کرتا ہے اور فتح کی صورت میں اس خطہ ارضی کا مالک کہلاتا ہے۔جنگ کے دوران بہت سے مظلوم،پست،نادار اور غریب لوگوں کا ناحق خون ہوتا ہے اور ان جنگوں میں استعمال ہونے والا بارود دوسری مخلوق کا بھی جینا دوبھر کر دیتا ہے۔منشایاد نے اردو افسانے کا آغاز ۱۹۵۵ء کے بعد کیا۔اس دوران اور بعد میں اقتدار کی خاطر بہت سی جنگیں لڑی گئیں۔ان جنگوں کو منشایاد نے اپنے دو افسانوں کا موضوع بنایا جن میں "بچہ اور بارود" اور "ایندھن" ہیں۔ان کا افسانہ "ایندھن" میں ایک سپاہی زخموں سے چور ایک طرف پڑا ہوا ہے اس کو اپنے زندہ ہونے کا بھی یقین نہیں اچانک اس کے ایک ایک عضو میں درد اٹھتا ہے جس سے اسے اپنے زندہ ہونے اور اعضاء کے بچ جانے کی خوشی اور زخموں کا درد بیک وقت محسوس ہوتا ہے۔وہ وہاں بے یار و مددگار پڑے ہوئے سوچتا ہے کہ

"پتہ نہیں جہاں گولیاں بنتی ہیں وہاں کسی کو خیال آتا ہو کہ ان گولیوں سے کون اور کیسے لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں؟ کتنے خواب ویران ہو سکتے ہیں اور کتنے بچے یتیم ہو سکتے ہیں۔"(۶)

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مزید دھماکوں اور گولیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جس سے پوری فضا دھوئیں سے بھر جاتی ہے۔بہت سے پرندے بارود کے شور اور دھوئیں سے اڑ جاتے ہیں۔ایسے منظر کو قلم بند کرتے ہوئے منشایاد لکھتے ہیں:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 18. Issue 01, June 2026

"دھماکوں اور پرندوں کی آوازوں کا شور فضا میں پھیلا ہوا تھا اگر چہ روشنی تھی مگر دھوئیں اور بلند قامت درختوں کے سایوں کی وجہ سے زیادہ دور کی چیزیں صاف نہیں نظر آتی تھی اور گھنے جنگل اور غاروں نے ابھی سے دھوپ اور روشنی کا راستہ روک دیا تھا۔"(۷)

عرصے تک ان دھماکوں کے اثرات آنے والی نسلوں پر نمودار ہوتے ہیں مگر طاقت کے نشے میں مدہوش انسان یہ سوچنے سے قاصر ہے انسانیت کی جان کو خطرا تو پہلے اٹیم بم سے ہی لاحق ہو گیا تھا مگر اس کے عملی اثرات پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں سامنے آئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر اٹیم بم گرایا جس سے لاکھوں لوگ مارے گئے، ان دھماکوں کے اثرات کی وجہ سے بعد میں پیدا ہونے والے بچے معذور تھے۔ ان کا افسانہ "بچے اور بارود" کے مطابق جنگیں ہمیشہ امن پسند لوگوں پر مسلط کی جاتی ہیں۔ اس کہانی میں بھی ضرورت کے تحت سادہ اور امن پسند خاندان کے باپ اور بیٹے کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور وہ دونوں شہید ہو گئے کیوں کہ ان کو جنگ لڑنی نہیں آتی تھی اور وہ نہ تو بندوق چلانا جانتے تھے نہ اپنا دفاع کرنا۔ شہادت کے بعد جب بڑھیا سے انٹرویو لیا گیا تو اس نے کہا:

"میں کیا بتا سکتی ہوں بیٹی۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے میں تو اس حیثیت سے جانتی تھی کہ اس نے کبھی چیونٹی تک ہلاک نہیں کی۔ میں نے تو اسے کبھی کسی مویشی تک کو مارتے پیٹتے نہیں دیکھا ہو سکتا ہے بھرتی کے بعد اس میں تبدیلی آگئی ہو، لیکن مجھے اتنا یقین ہے وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔"(۸)

اسی جنگ میں سپاہیوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے عورتوں اور بچوں کو بھی بھرتی کیا گیا۔ ان کے ذمے اسلحہ اور بارود فراہم کرنا اور ان کا سامان اٹھانا تھا۔ اس کے علاوہ وہ دشمن کی حرکات پر نظر رکھتے اور ان کے بارے میں خبریں اکھٹی کرتے۔ دشمن کے پسپا علاقوں میں بارودی سرنگوں کے بارے میں معلومات بھی بچوں کو بھیج کر حاصل کی جاتی۔ ان ہی بارودی سرنگوں کا پتہ لگاتے ہوئے اس بدنصیب بڑھیا کا بیٹا بھی شہید ہوا۔ اس جنگ کے بارے میں کہتی ہے:

"ایک دن دھماکوں کی آواز سنائی دی اور سارے پنچھی دانا دانکا چگنا بھول گئے فضا میں شگوفوں کی بدبو کی جگہ بارود کی بو پھیل گئی۔ اس سے پہلے کبھی ہوائی جہاز گزرتا تھا تو میرا بیٹا بھاگ کر کسی ٹیلے / چھت پر چڑھ جاتا اور اڑتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر خوش ہوتا مگر دھماکوں کی آواز سن کر بدلنے لگا۔ بھاگ کر سب سے پہلے ان خندقوں میں گھس جاتا۔ جو ہم نے بڑے بوڑھوں کی ہدایت پر گھروں کے قریب کھودی تھیں۔"(۹)

ان کا افسانوی مجموعہ "بند مٹھی میں جگنو" کا بھارت کی آٹھ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس افسانے کا نمایاں کردار ایک لڑکی ہے جس کو شہروں کے دوغلا پن، مادیت پرستی اور منافقت سے نفرت تھی اس لڑکی میں جنسی اور نفسیاتی ہیجان بھی پایا جاتا ہے۔ اسے شہری زندگی سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں میں آتی ہے۔ یہاں جب اسے تنہائی ملتی ہے

تو اسے شہر کی مصروف ترین زندگی یاد آتی ہے جب وہ جلدی میں اپنا کھانا روز نہیں بنا سکتی اور نہ ہی وقت پر کھانا کھا سکتی ہے۔ اپنی سبزیاں اور فروٹ تازہ رکھنے کے لیے فریج کا استعمال کرتی ہے وہ کھانے کو فریج میں بند کرنے کو طنزیہ انداز میں تازگی کا عالم گیر قحط قرار دیتی ہے۔ کھانے کو سورج کی حرارت سے بچانے کے لیے کئی کئی دن فریج میں رکھا جاتا جس سے وہ خراب تو نہیں ہوتا البتہ اپنا ذائقہ اور غذائیت کھو دیتا ہے۔ آج کل فروزن فوڈ کا رجحان بہت بڑھ رہا ہے جس میں دودھ، گوشت اور سبزیوں کو کئی کئی مہینے سٹور کیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"تازگی کو سورج کی شعاعوں سے بچا کر کئی کئی دن تک رکھا جاتا تھا تازگی آٹھ آٹھ دن کی مری ہوئی مچھلیوں کی صورت بکتی تھی۔ جسموں کی بوسیدگی کو ڈھانپنے کے لیے نت نئے فیشن رائج ہوتے تھے اور آؤٹ آف ڈیٹ نظریات پر لفظوں کا ملمع چڑھایا جاتا تھا۔"(۱۰)

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کے مطابق درخت اس زمین کی قدیم ترین مخلوق ہے درخت اور انسان کا رشتہ قدیم اور صدیوں پرانا ہے۔ انسان اور درخت کے درمیان تعلق کو منشایاد نے اپنے افسانے "درخت آدمی" کی صورت ظاہر کیا ہے کرمو بڑے چوہدری کے باغ میں ایک مالی تھا۔ کرمو کو درختوں سے بہت پیار تھا کسی درخت کے کاٹنے پر اسے بہت افسوس ہوتا راوی لکھتا ہے کہ

"درخت کرمو کی کمزوری تھے وہ کسی بھی قسم کے درخت کاٹتے یا گرتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ باغ کے درختوں کی چھنگائی بھی اس احتیاط سے کرتا جیسے ماہر حجام بال تراشتے ہیں۔ جب کبھی وہ کسی درخت کے کاٹنے کی خبر سنتا تو اسے اتنا ہی صدمہ ہوتا جتنا کسی عزیز کے مرنے پر ہو سکتا ہے۔"(۱۱)

گاؤں کے چوپال میں واقع بوڑھا برگد کا درخت تھا، اسے وہ بہت عزیز تھا۔ اس کے سایے میں سب بیٹھتے اور موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں۔ چوہدری کی وفات کے بعد جائیداد بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ باغ والی زمین چوہدری کے منجھلے بیٹے کے حصے میں آئی۔ وراثت کی تقسیم سے باغ بھی اجڑ گیا۔ جب کرمو کو گاؤں کی صاف ستھری آب وہوا راس تھی تو وہ گاؤں چھوڑ کر شہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ باغ کا ختم ہونا کرمو کے لیے زندگی ختم ہونے مترادف تھا، وہ اسی غم میں بیمار ہو گیا، باغ اجڑنے کی وجہ سے چھوٹے چوہدری نے کرمو کو دوائی دلوانے اور زیادہ تنخواہ کا لالچ دے کر اسلام آباد بلالیا۔ اور وعدہ کیا کہ وہ ٹھیک نہ ہوا تو واپس گاؤں بھیج دے گا۔ دوائی سے اسے کچھ افاقہ ہوا مگر درختوں سے اس کا ناطہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ چھوٹے چوہدری کے ساتھ سیر کو جاتا راستے کے درخت اسے اجنبی لگتے جیسے وہ ان کی زبان سے واقف نہ ہو۔ پھر اس کا مالک اسے روز گارڈن میں پھولوں کی نمائش میں لے گیا۔ چوہدری کی کوٹھی میں بھی وہ باغبانی کا شوق پورا کر سکتا تھا۔ شہر کی رونق اور ضرورتوں کے پہاڑ نے اسے مقروض کر دیا، وہ اب باغ میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا:

"درخت خوش اور ناراض ہو سکتے ہیں اور خاص حد تک اپنی خدمت کرنے یا نقصان پہنچانے والے ہاتھوں کو پہچانتے تھے"(۱۲)

کوٹھی میں کرمو نے کچھ عرصہ مالی کے طور پر بھی کام کیا۔ منجھلے چوہدری کے گھر میں ایک آم کا درخت لگایا جس سے کرمو اپنے بیٹوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد چوہدری صاحب کے ایک ٹھیکدار دوست نے کوٹھی کی توسیع کرکے انیکسی بنانے کا مشورہ دیا، جس کی تعمیر کے لیے آم کا درخت بھی کاٹنے کا کہا گیا۔ کرمو کو یہ درخت بہت عزیز تھا۔ اس کو کاٹنے کا کام بھی کرمو اکے ذمے لگایا گیا کرمو کو ایسے لگا جیسے کوئی عزیز قتل ہوا ہو۔ کرمو کو مجبوری کے مارے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ وہ لکھتا ہے:

"اچانک درخت کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کرمو کی ایسی چنگاڑ جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ چیخ تھی یا نعرہ۔ سب دوڑتے ہوئے پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ وہ درخت گرا پڑا ہے اور خون میں لت پت۔ کرمو اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔"(۱۳)

اس افسانہ میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ چیخ تھی یا نعرہ۔ کرمو جیسا قدیم انسان تخلیقی سطح پر زندہ تھا، اس کے لیے یہ ساری کائنات ایک گھر / باغ تھی۔ درخت، چرند، پرند، پہاڑ، سمندر، ستارے سب اس کی برداری میں شامل تھے، وہ ان کے قریب رہنے کی وجہ سے ان کے مسائل کو سمجھتا تھا، اس لیے وہ ان سے ہم کلام ہو سکتا تھا۔ مگر آج کا جدید سرمایہ دار انسان فطرت سے دوری کی بناء پر ان کو سمجھنے سے قاصر ہے اور وہ ان قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال کر رہا ہے جیسے فطرت ایک مشین کی طرح چیزیں بنا رہی ہو اور وہ ان کو ضائع کرتا جائے۔

دیہاتی اور شہری منظر نگاری پر لکھا گیا افسانہ "ایک تھی فاختہ" ہے۔ جس بچے کو بہلانے، پھسلانے کی خاطر اس کا باپ کہانی سناتا ہے، جس میں فاختہ کا ذکر آتا ہے۔ جس سے بچہ نہ صرف بہل جاتا ہے بلکہ فاختہ دیکھنے کی فرمائش بھی کرتا ہے، باپ خوشی خوشی یہ بات مان جاتا ہے۔ ایک دن اس کا باپ قریبی باغ میں لے گیا مگر وہاں کوئی فاختہ نظر نہیں آتی۔ وہ دو تین دن تک مسلسل باغ میں جاتے رہے مگر وہاں پر دوسرے پرندے تھے مگر فاختہ غائب تھی۔ مصنف لکھتے ہیں:"کچھ عرصہ پہلے شہر کے اسلحہ ڈپو میں بہت سے دھماکے ہوئے تھے، سنا تھا بہت سی فاختائیں مر گئی تھیں۔ کیا پتہ ساری مر گئی ہوں یا جو بچ گئی ہوں مزید دھماکوں کے ڈر سے شہر چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں کی طرف نکل گئی ہوں۔"(۱۴) اس نے تنگ آکر محکمہ باغات کے دفتر میں فون کرکے پوچھا تو معلوم ہوا جہاں پر کوے زیادہ ہو جاتیں، وہاں سے فاختائیں کوچ کر جاتی ہیں۔ اس افسانے میں فاختہ امن اور توازن کی علامت ہے جب کہ کوے دہشت گردی اور فطرت کے نظام میں دہشت گردی کی علامت کے طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرا افسانہ جو شہری زندگی پر لکھا گیا وہ ہے "ببول سے لپٹی ہوئی بیل" جس میں لاہور شہر کی مصروف، تیز ترین اور مفاد پرست زندگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ شہروں میں گاؤں سے ہجرت کرکے آنے والے لوگوں میں اپنائیت اور اجنبیت کی کشمش پائی جاتی ہے اس افسانے کا کردار روزگار کی خاطر گاؤں سے شہر کی طرف آتا ہے تو اسے ہر وقت گاؤں کی یاد ستاتی ہے۔ یہ ہی یادیں اسے بیمار کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر اس کی حالت زار دیکھ کر گاؤں جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اس کی کیفیت یوں تھی:"ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے کھوئی ہوئی کوئی چیز مل گئی ہو۔"(۱۵) مصنف بن نگاری کو موضوع بناتے ہوئے اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہمیں اپنی ثقافت اور روایت کو بھی بچانا ہے۔ شہری زندگی کے آغاز پر تیسرا افسانہ "مائی فٹ" ہے جو چوہدری نور محمد کی چوہدرہٹ کی کہانی ہے۔ پکی سڑک

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 18. Issue 01, June 2026

ترقی اور ٹیکنالوجی کی علامت ہے۔اس پر موٹر اور مشینیں چلتی ہیں۔یہ قدامت پسندی اور جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ نظام کے ابتداء کی شنید ہے۔

ان کا افسانہ "دام شنیدان" ہے جس کا مطلب ہے سننے کا جال۔یہ ایک فارسی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے وہ طریقہ جس سے باتیں ایک دوسرے تک پہنچ جائیں۔منشایاد کے ہاں دام شنیدان کا سلسل جانداروں اور انسانوں کے درمیان جاری وساری ہے۔ان کی ایک آواز ہے جو سنائی دیتی ہے اور مفہوم رکھتی ہے۔ماہر لسانیات کے مطابق یہ ہی آوازیں ابلاغ کی اولین صورت ہیں۔ان کی ترتیب و تنظیم زبانی کلام سے تحریری مکالمے میں تبدیل ہو گئی۔یہ ہی آوازیں انسانی اور حیوانی زبان میں فاصلے کو کم کرتی ہیں۔ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کے ایک مضمون کے مطابق:

"ماحولیاتی ادب فطرت کی خاموشیوں اور غیر انسانی دنیا کی آوازوں کو سمجھنے اور سماجی وثقافتی تناظرات میں ان کے مفہوم و معنی کے تعین کی کوشش کرنا ہے۔"(۱۶)

افسانے کے راوی کو زبانیں سیکھنے کا شوق تھا تو بکرے بکریوں کی زبانیں سیکھ گیا اور گھر میں اپنے محبوب بکرے کی قربانی کے بعد گوشت کھانا چھوڑ دیا۔جب وہ گوشت کھانے لگا تو اسے بکرے کی اپنائیت محسوس ہوئی۔

"جب کھانے کا وقت آیا تو مجھے گوشت سے ویسی ہی بو آئی جیسے اپنے نومولود بیٹے سے آتی تھی اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔"(۱۷)

اسی طرح جانداروں سے اپنائیت کا دوسرا افسانہ "کاگ اپنا اپنا" ہے اس افسانے کا مرکزی کردار روز ماں سے کہانی سنتا تھا۔ اس کو ماں سے چڑا چڑیا کی کہانی سننے کے بعد چڑیا کی بدیانتی کی وجہ سے نفرت ہو گی،اوراس کو کوے اچھے لگنے لگے۔پیاس بجھانے کے لیے کوے کی حکمت عملی اور گھر میں کسی مہمان کے آنے کی خبر نے اس کے دل میں گھر کر لیا اور اس نے کوے سے دوستی کر لی۔یہ دوستی مرتے دم تک جاری رہی۔جب وہ اعلی تعلیم کے لیے گھر سے باہر کالج/یونی ورسٹی گیا تو یہ کوا بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔اتنی پرانی دوستی کے باوجود بھی کوا اس پر اعتبار نہ کرتا اور کسی اونچی جگہ جا کر بیٹھ جاتا۔جب کہ دوسری طرف مصنف اس کے بارے میں اکثر بہت پریشان رہتا تھا۔وہ لکھتا ہے کہ "میں نے بارش اور جاڑے کی اتنی راتیں اس کی فکر میں گزاریں کہ بعض اوقات مجھے لگتا میں نے ایسی ہر رات خود اس کے ساتھ بیٹھ کر گزاری ہے۔"(۱۸) مصنف کی ناہید سے شادی کے بعد وہ شہر آکر ملازمت کرنے لگا۔وہاں پر ہی اپنے رہنے کے لیے ایک بنگلہ بنوایا۔اس بنگلے کے ایک باغ میں وہی کوا رہنے لگا۔ملازمت سے سبکدوش ہونے اور بیٹے کی شادی کے بعد وہ واپس گاؤں آگیا۔کوا بھی اس کے ساتھ واپس گاؤں آگیا اورایک طوفان میں وہ کوا مر گیا۔زوال آدم سے پہلے بھی انسان جانوروں سے مکالمات کر سکتا تھا جیسے حضرت سلیمانؑ تمام جانداروں کی زبان سمجھتے تھے۔ان کا افسانہ "پانی میں گھرا پانی" ایک کمزور اور جنسی لحاظ سے بانجھ شخص کا قصہ ہے،جو زیناں کو ایک گائے اور بھینس کے بدلے خرید کر لایا تھا۔یہ شخص کاریگر ہے اور چکنی مٹی سے بیل،بندر،گھگو گھوڑے بناتا ہے وہ تپتپاتی دھوپ میں بوڑھے شریںہہ (سرس) کے درخت کے نیچے بیٹھا کر کام کرتا ہے زیناں کا شوہر دتہ اس بوڑھے درخت کے ساتھ ساتھ

ایک اور ایسا ہی درخت لگانا چاہتا ہے وہ اس درخت کے بارے میں کہتا ہے: "یہ بڑا برکت والا ہے اس نے کہا یہ نہ ہو تا تو بڑھائی مانگنے والوں کو گھر تلاش کرنے میں دقت پیش آتی، سارے گاؤں میں یہ ہی ایک شرینہہ ہے۔"(۱۹)

اس کی بھی ٹہینیاں گاؤں والوں نے توڑ توڑ کر جلالی تھیں۔ برسات کے موسم میں اچانک اس کے گھر میں ایک نیا شرینہہ کا پودا اگا آتا ہے ایک طرف فطرت مہربان ہوتی ہے تو دوسری طرف انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ جب وہ چکنی مٹی سے ایک دن خوب صورت باوا بناتا ہے اس کو پکنے کے لیے تیز دھوپ میں رکھتا ہے تو باوا غائب ہو جاتا ہے۔ باوے کا گم ہونا انسانیت کے ختم ہونے کی نشانی ہے۔ جس پر کوئی احتجاج نہیں ہو رہا۔ منشا یاد کی کہانیوں میں عصری سچائی کی ہیبت ناک تصویر کشی کی گئی ہے۔

منشا یاد کا افسانہ "بانجھ ہوا میں سانس" ایک نیم علامتی افسانہ ہے، جو ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے موسموں میں شدت کی نشان دہی کرتا ہے، ایسے حالات میں چیزیں خالص نہیں ملتی تو ہوا کیسے خالص مل سکتی ہے۔ اس افسانے میں شدید گرمی کے موسم میں ہوا بند ہونے کی وجہ سے حبس اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہوا کی اس کیفیت کو منشا یاد یوں بیان کرتا ہے: "حبس سے دم گھٹا جاتا تھا۔ پتہ نہیں ہوا کو کیا ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری ہوا باسی ہو گئی ہے اور خود تازہ جھونکوں کی تلاش میں ادھر ادھر ٹامک ٹوئیے مارتی پھرتی ہے۔ منڈیروں کو چھو کر گزرتے ہوئے اس کی کراہیں نکلتی ہیں۔"(۲۰)

یوں لگتا تھا ہوا سے کوئی چیز نکال لی گئی ہے۔ وہی چیز سارے سلنڈروں میں بھر کر ڈپوں میں فروخت کی جا رہی ہے ہر شخص کو زندہ رہنے کے لیے یہ سلنڈر ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ سانس لینے کے لیے آکسیجن کے سلنڈر منگوائے جا رہے تھے۔ ان سلنڈروں پر بھی صاحب اختیار لوگوں کا قبضہ ہے جن میں ملک صاحب بھی شامل ہیں جو فیتے کی جوان لڑکی پر بری نظر رکھے ہوئے ہے ایسے حالات میں اسے موقع مل جاتا ہے وہ کہتا ہے:

> "تمہیں پتہ ہونا چاہیے فیتا کہ ساری دنیا میں ہوا کی راشننگ ہو گی ہے جس طرح آٹا، گھی، تیل ،چاول، چینی اور زندگی کی دوسری چیزیں کارڈ پر ڈپوؤں سے ملتی ہیں بالکل اسی طرح شہروں کے لوگ تعلیم یافتہ اور عقل مند ہوتے ہیں وہاں تمام انتظامات پہلے ہی کر لیے گئے ہیں۔ گھروں ،کارخانوں، دکانوں، ہوٹلوں، کلبوں، سینما گھروں، ہسپتالوں اور عبادت گاہوں یہاں تک کے بسوں اور کاروں میں بھی گیس کا مناسب انتظام کر لیا گیا ہے۔ جگہ جگہ ایسے ڈپو قائم کیے گئے ہیں جہاں سے پیدل چلنے والوں کو کارڈ دیکھ کر گیس سلنڈر فروخت کیے جا سکیں مگر تم دیہاتی لوگوں کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔"(۲۱)

جب اس کا دم گھٹتا ہے تو اس کا دل کرتا ہے وہ سلنڈر چھین کر بھاگ جائے مگر اسے اپنے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرتا ہے۔ ملک رازدارانہ انداز میں کہتا ہے کہ تم اس کے بدلے داری والی شرط منظور کر لو۔ فیتا سلنڈر کے بدل داری کی عصمت فروشی والی شرط مان لیتا ہے۔ اس افسانے کا اختتام ان الفاظ میں کرتا ہے:

"سلنڈر کی بو سونگھتے ہی اس کی بیوی اور بیٹا ہوش میں آجاتے ہیں۔ ساتھ والی چارپائی پر چھوٹا ملک
داری کو ہوش میں لاتا اور۔۔۔"(۲۲)

ان کے دو افسانے ایکو فیمنزم کی نمائندگی کرتے ہیں ایک "شجر بے سایہ" جس میں باپ کا سایہ نہ ہونے کی وجہ ست بھرئی کو اس کے بھائی کو عزت و عصمت کے نام پر قتل کر دیتے ہیں۔ چند برس بعد جب اس کے بھائی کی بیٹی کے قدم ڈگمگاتے ہیں تو اس کا باپ اس رسم کی بھیٹ چڑھنے سے بچا لیتا ہے اور دوسرا افسانہ "جڑیں" ہے جس میں منشایاد اسٹیج پر ناچنے گانے والی عورتوں کو بھی اپنی ماں بہنوں کی طرح عزت دینے کی تلقین کرتا ہے۔

انسان قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال کر رہا ہے۔ جیسے یہ فطرت نہ ہو، کوئی چیزیں بنانے والی فیکٹری ہو، اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے قدرتی وسائل کم ہو رہے ہیں۔ ان ہی قدرتی وسائل میں ایک پانی ہے، آبی ذخائر روز بہ روز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ پانی زندگی کی علامت ہے اس کے بغیر اس سیارے پر زندگی کا کوئی نام و نشان نہیں رہے گا، اسی اہم موضوع پر منشایاد کا افسانہ "بوکا" ہے۔ اس افسانے میں راوی خوفناک خواب دیکھتا ہے کہ ایک گہرے اور اندھیرے کنوئیں میں پانی ہی نہیں تھا۔ پانی نہ ہونے کا سوچ کر ارد گرد کھڑے لوگوں کے چہرے مرجھا جاتے ہیں۔ ایسی خوف ناک منظر نگاری کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

"وہ باری باری کنوئیں کے اندر جھانکتے اور پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان
پھیرنے لگتا ہوں۔ ان میں سے ایک بار بار کھنکارتا، تھوک سے گلا تر کرتا ہے اور کہتا ہے: "کچھ
کرو۔۔۔ ورنہ سب پیاس سے مر جائیں گے۔"(۲۳)

یہاں صرف پانی ہی ختم نہیں ہوا بلکہ کنوئیں سے پانی نکالنے والا بوکا بھی نہیں مل رہا امید کی جو رہی سہی کرن تھی وہ بھی بجھ جاتی ہے۔ خواب کے دوسرے حصے میں اگر بوکا ملتا بھی ہے تو ایک آدمی چھری سے اس کی رسی کاٹ دیتا ہے اور دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ راوی لکھتا ہے: "وہ نیفے سے چھری نکالتا ہوا میں لہراتا اور تنی ہوئی رسی کاٹ دیتا ہے، پھر ہنستا ہوا ایک طرف چلا جاتا ہے دہشت اور خوف کے مارے سب خاموش رہتے ہیں۔ کنوئیں کے اندر سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آتی ہے میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔"(۲۴)

یہ ہنسنے والا شخص عام آدمی نہیں تھا بلکہ صاحب اختیار، سرمایہ دار اور بیوروکریٹ تھا جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں کا جینا دوبھر کر دیتا ہے۔ جہاں جنگل تھے وہ کاٹ کر کھیت بنائے گئے، غاروں کی جگہ گاؤں، گاؤں سے شہر اور شہر سے ہاؤسنگ سوسائٹی بناتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے دوسروں جانداروں کا جینا حرام کر دیتا ہے۔ ان کے ایک افسانے کا نام "پولی تھین" بھی ہے جس کا موضوع تہذیبوں کی آویزش ہے۔ کالو قدیم تہذیب کا نمائندہ ہے جب کہ پولی تھین نئی تہذیب کی علامت ہے اس ہی پولی تھین یعنی پلاسٹک بیگز نے انسانوں کے ساتھ ساتھ دوسری زمینی مخلوق کا جینا محال کر رکھا ہے۔ ان حالات کا ذمہ دار ایک فرد نہیں بلکہ ہم سب ہیں جو قدرت کے اشاروں کو نہ سمجھ سکے۔ ان کا افسانہ "زوال سے پہلے" کے ایک کردار کے مطابق: "بادلوں نے بہت عرصہ پہلے ان کے کھیتوں پر برسنا چھوڑ دیا تھا۔۔۔ موسموں میں ان کی آنکھوں کے سامنے تغیر ہوا۔ سورج نے دیر سے نکلنا اور جلدی ڈوب شروع کر دیا، مگر یہ بے خبر وقتی

لذتوں میں کھوئے رہے۔"(۲۵) انسان کو اپنے رویے اور طرز زندگی کو بدلنا ہوگا۔ ورنہ مزید حالات خراب ہونے کی صورت میں حضرت انسان اس سیارے کی جان چھوڑ کر کسی اور خلائی سیارے کو آباد کر دے گا ایسا بھی ہونا آنے والے سو سالوں میں ممکن نہیں۔

منشایاد کے افسانوں میں ماحولیاتی تنقید کے لحاظ سے مثبت اور منفی دونوں قسم کے کردار ملتے ہیں کہیں پر ماحول دوست کرمو کا کردار ہے تو کہیں پر آج کا مفاد پرست سرمایہ دار، جو قدرتی وسائل کو صرف اپنے استعمال میں لانا چاہتا ہے، ایک غریب کسان اپنی بے بسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی عزت و عصمت کا سودا کرتا ہے، یوں منشایاد اپنے کرداروں کے ذریعے اپنے قاری کو تنبیہ کرتا ہے کہ اپنے قدرتی ماحول کی بربادی خود انسان کی بربادی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ بشارت نور، ڈاکٹر، ادب اور ماحولیات: پاکستانی اردو نظم کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص۱۵

۲۔ سہیل احمد، ڈاکٹر، ماحولیاتی تنقید کا نظریہ اور اردو شاعری، فیس بک پوسٹ، ۴ فروری ۲۰۱۸ء

۳۔ گلاٹ فیلٹی شیرل، Literary study in an age of Environmental Crisis مشمولہ، The ecocriticism Reader:Landmarks in literary Ecology مرتبہ گلاٹ فیلٹی، ہیرالڈ فرام (ایتھنز اینڈ لندن: یونی ورسٹی آف جارجیا پریس ۱۹۹۷ء، ص۲۲۱

۴۔ بشارت نور، ڈاکٹر، ادب اور ماحولیات: پاکستانی اردو نظم کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ (منتخب شعرا کی نظموں کے حوالے سے)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص ۲۴

۵۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص۱۶

۶۔ منشایاد، وقت سمندر، ماڈرن بک ڈپو آبپارہ، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص۱۵۱

۷۔ ایضاً، ص۱۵۰

۸۔ ایضاً، ص۱۹۰

۹۔ ایضاً، ص۱۸۹

۱۰۔ منشایاد، شہر افسانہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص۲۵

۱۱۔ ایضاً، ص۲۷۶

۱۲۔ ایضاً، ص۲۸۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۱۴۔ منشایاد، بند مٹھی میں جگنو، مکتبہ شہکار، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص۱۷۰

۱۵۔ منشایاد، وقت سمندر، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۹

۱۶۔ اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر، ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ (حصہ اول)، ادبی میراث ویب گاہ، ۲۵ جون ۲۰۲۱ء

۱۷۔ منشایاد، وقت سمندر، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۲۹

۱۸۔ منشایاد، شہر افسانہ، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۸

۱۹۔ منشادیاد، ماس اور مٹی، ماڈرن بک ڈپو آبپارہ، اسلام آباد، ۱۹۸۰، ص ۲۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۹۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۲۳۔ منشایاد، خلا اندر خلا، برق سنز، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۵۔ منشایاد، وقت سمندر، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۷۶

References in Roman Script:

1. Basharat Noor, Dr., Adab aur Maholiyat: Pakistani Urdu Nazm ka Maholiyati Tanqeedi Mutala‘a, National University of Modern Languages, 2023, p. 15
2. Suhail Ahmad, Dr., Maholiyati Tanqeed ka Nazriya aur Urdu Shayari, Facebook Post, 4 February 2018
3. Cheryll Glotfelty, Literary Study in an Age of Environmental Crisis, in The Ecocriticism Reader: Landmarks in Literary Ecology, eds. Cheryll Glotfelty and Harold Fromm (Athens & London: University of Georgia Press, 1997), p. 221
4. Basharat Noor, Dr., Adab aur Maholiyat: Pakistani Urdu Nazm ka Maholiyati Tanqeedi Mutala‘a (Muntakhib Shu‘ara ki Nazmon ke Hawale se), National University of Modern Languages, Islamabad, 2023, p. 24
5. Mansha Yaad, Shehar Fasana, Dost Publications, Islamabad, 2003, p. 16
6. Mansha Yaad, Waqt Samandar, Modern Book Depot, Aabpara, Islamabad, 1980, p. 151
7. Ibid., p. 150
8. Ibid., p. 190
9. Ibid., p. 189
10. Munsha Yaad, Shehar Fasana, Dost Publications, Islamabad, 2003, p. 25
11. Ibid., p. 276
12. Ibid., p. 280
13. Ibid., p. 282
14. Munsha Yaad, Band Mutthi Mein Jugnu, Maktaba Shahkar, Lahore, 1979, p. 170
15. Munsha Yaad, Waqt Samandar, Islamabad, 1980, p. 119
16. Aurangzeb Niazi, Dr., Adab ki Maholiyati Sheriyat aur Urdu Afsana (Hissa Awwal), Adabi Miras Website, 25 June 2021

17. Munsha Yaad, Waqt Samandar, Islamabad, 1980, p. 29
18. Munsha Yaad, Shehar Fasana, Islamabad, 2003, p. 148
19. Munsha Yaad, Maas aur Mitti, Modern Book Depot, Aabpara, Islamabad, 1980, p. 28
20. Ibid., p. 96
21. Ibid., p. 98
22. Ibid., p. 100
23. Munsha Yaad, Khala Andar Khala, Barq Sons, Islamabad, 1983, p. 15
24. Ibid., p. 22
25. Munsha Yaad, Waqt Samandar, Islamabad, 1980, p. 176

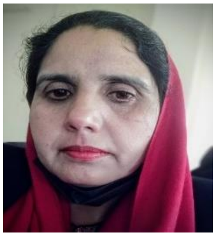

Dr. Sakina Siddique is a Lecturer in Urdu at Government Graduate College for Women Rawalpindi, Pakistan. She earned her PhD from National University of Modern Languages, Islamabad. Her academic interests include Urdu fiction, Feminism and world literature. She has contributed to scholarly research with four published articles in her field.

Dr. Kausar Parveen is an Assistant Professor at Ghazi National Institute of Engineering & Sciences Dera Ghazi Khan, Pakistan. She earned her PhD from National University of Modern Languages, Islamabad. Her academic specialization is Urdu Fiction, and she has two published research articles to her credit.